قرآن کے تصورِ رحمت پر مسیحی اشکالات: تجزیاتی مطالعہ

Objections of Christianity on the Quranic concept of Allah's Mercy

1) **Dr. Zulfiqar Ahmad**

Research Sholar, Village Dalowal, Tehsil and Distt.Mandi Baha-ud-din, Email: muhammadzulafqar8@gmail.com

KEYWORDS

Mercy of Allah in Quran Objections of Christianity, Allah's love and mercy with man

ABSTRACT

Christianity has brought this denial that perception of God mentioned in Quran is cruel. According to this perception, God feels obliged to reveal curse upon his creatures, whereas, in other religions especially in Christianity, the love of God for human beings is fatherly love. According to the Quranic point of view, the love of God for his creatures especially for human beings is not limited to the love of father and son, but the reality is that He is very merciful and loves human beings. He, along with his pious men, never disappoints the hopeless and sinful persons as well. He calls the people in a loving tone that O, my people, leave the path of destruction and come towards blessings and success

تعارف

مسیحیت کی طرف سے یہ اشکالات پیش کیے گئے ہیں کہ قرآن جو تصورِ الٰہ پیش کرتا ہے وہ ظالمانہ ہے، غضب پر مبنی ہے، اس میں بندوں کے لئے محبت و رحمت والی چیز نہ ہے بلکہ اس میں خدا اپنے بندوں کو سزا اور عذاب دے کر خوش ہوتا ہے۔ اس بابت علامہ برکت اللہ ''مسیحیت کی عالمگیری'' میں لکھتے ہیں کہ قرآنی تعلیم کا جو غلط پہلو ہے کہ خدا ایسی جابر ہستی ہے جو اپنے قہر سے گناہ گار انسان کو فنا کر دیتی ہے اور دوزخ میں ڈال کر خوش ہوتی ہے۔[1]

ایسا بے بنیاد زہر اگلنے میں مسیحیت کے پادریوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے یہ تصور اصل میں قرآن اور بائبل دونوں کے خلاف ہے کسی الہامی کتاب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ میں انسان کو عذاب دے کر خوش ہوتا ہوں۔ ایسے اشکالات زیادہ تو مسیحیت کی طرف سے پیدا کیے گئے ہیں لیکن دوسرے مذاہب باطلہ نے بھی اِس ضمن میں اپنا حصہ ضرور لیا ہے۔

رحمتِ الٰہی کے قرآنی تصور پر اشکالات: علمی جائزہ

اس بابت پادری برکت اللہ نے سابقہ مسیحی مفکرین کی روش اختیار کرتے ہوئے اعتراضات اٹھائے ہیں۔ اس کے علاوہ برکت اللہ کے ہم عصر پادریوں جن میں پادری سلطان محمد خاں، پادری عبدالحق اور مسٹر موسیٰ خاں شامل ہیں، نے بھی اپنی منفی سوچ کا اظہار کیا ہے۔ اس بحث میں صرف پادری علامہ برکت اللہ کی طرف سے اس بابت پیدا کیے گئے اشکالات کو سامنے لا کر قرآن اور بائبل کی روشنی میں ان کا ردّ پیش کیا جائے گا۔

---

[1] برکت اللہ۔ **مسیحیت کی عالمگیری**۔ لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب ۲۰۰۱، ص: ۸۰

Barkatullah. *Masihiyat ki Alamgeeri*. Lahore: Al-Faisal Nashran wa Tajiran-e-Kutub, 2001, p. 80

اس بحث کا مقصد قرآن کے تصورِ رحمت و عدلِ الٰہی کے خلاف پیدا کیے گئے اشکالات کا مدلل جواب دینا ہے۔ اس بابت قرآن اور بائبل کی تعلیمات پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہے کہ کونسی تعلیمات صحیح الہامی اور عقلِ سلیم کے مطابق ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔ بائبل بھی مقدس کتب کا مجموعہ ہے۔ اس تحقیق کا مقصد ہر گز یہ نہیں کہ بائبل کی اس بابت تعلیمات کو نشانہ بنایا جائے۔ یہ بات معلوم کرنی ہے کہ جب بائبل اور قرآن دونوں ہی الہامی کتب ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک صرف رحمتِ الٰہی کا پیغام دے اور دوسری صرف غضبِ الٰہی کا۔ قرآن اور بائبل کی روشنی میں اسی عنوان پر بحث کی جارہی ہے کہ کوئی بھی الہامی کتاب اپنے دور کے لوگوں کی بھلائی کے لئے ہی نازل کی جاتی رہی ہے۔ اگر کسی میں کوئی سخت حکم ہے تو وہ کسی مصلحت کے تحت ہی ہے نہ کہ انسانیت پر ظلم ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی نظریہ اور عقیدہ کے خلاف پادری علامہ برکت اللہ نے جو بے بنیاد اور سراسر تعصب پر مبنی بیانات جاری کیے ہیں ان کا قرآن ہی کی روشنی میں جائزہ لینا ہے۔ یہ پتہ چلانا ہے کہ کیا ایسے الزامات کا حقیقت سے بھی کوئی تعلق ہے۔

ذیل میں اس بابت پیدا کیے گئے اشکالات کا ذکر کر کے علمی جائزہ لیا جاتا ہے۔

خدا ایسی جابر ہستی ہے جو بندے کو فنا کر کے اور دوزخ میں ڈال کر خوش ہوتی ہے:

قرآن کے تصورِ الٰہ پر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ قرآن نے جو تصورِ خدا پیش کیا ہے اس کے مطابق خدا ایسی جابر ہستی ہے جو گناہ گاروں کو فنا کر کے اور ان کو دوزخ میں ڈال کر خوش ہوتی ہے۔

اس بابت پادری برکت اللہ لکھتے ہیں:

لیکن قرآنی تعلیم کا جو غلط پہلو ہے کہ خدا ایسی جابر ہستی ہے جو اپنے قہر سے گناہ گار انسانوں کو فنا کر دیتی ہے اور دوزخ میں ڈال کر خوش ہوتی ہے۔[2]

پادری صاحب نے بائبل کا بغور مطالعہ نہیں کیا جہاں بار بار غضب کی بات کی جارہی ہے بلکہ غضب کو نہ ہٹانے کا کئی مقامات پر وعدہ کیا گیا ہے۔

ایک مقام پر یوں بیان ہوا ہے:

(خدا اپنے غضب کو نہیں ہٹائے گا۔)[3]

پادری صاحب نے قرآن کا بغور مطالعہ کیے بغیر ہی یہ موقف اپنا لیا ہے۔ اگر آغاز سے ہی قرآن کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو واضح ہو جانا تھا کہ جو ذات اپنی پاک کتاب کے آغاز میں ہی رب، رحمٰن اور رحیم کے طور پر اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے وہ عذاب دے کر کس طرح خوش ہو سکتی ہے۔

---

[2] برکت اللہ، **مسیحیت کی عالمگیری**، ص: ۸۰

Barkatullah, *Masihiyat ki Alamgeeri*, p. 80

[3] ایوب ۹: ۱۳

Ayyub 9:13

قرآن میں تو اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح کیا ہے کہ وہ ذات اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرنا چاہتی۔

ایک مقام پر یوں فرمایا:

وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ[4]

(اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔)

ایک مقام پر تو اس طرح وضاحت کر دی کہ وہ ذات پاک تم کو عذاب دے کر کیا کرے گی۔

ارشاد ربانی ہے:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا[5]

(کیا کرے گا اللہ تم کو عذاب دے کر اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو اور اللہ قدر دان ہے، سب کچھ جاننے والا۔)

ان آیات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کو یہ باور کروا رہا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے اتنی محبت رکھتا ہے کہ ان کو عذاب ہر گز نہیں دینا چاہتا۔ ادھر " يُرِيدُ " کے الفاظ آئے ہیں کہ اللہ پاک ایسا ارادہ ہی نہیں رکھتا اور دوسری آیت میں تو مزید یقین دلا دیا کہ تم کو عذاب دے کر اللہ تعالیٰ کو کیا حاصل ہو گا، وہ اپنے بندوں کو کیوں عذاب دے گا اگر وہ تقویٰ اور شکر گزاری کو اختیار کیے رہیں گے۔

اس کے علاوہ قرآن میں ہزاروں مقامات پر اللہ اور بندے کے تعلق، قرابت اور اللہ کی بندے سے محبت کا تذکرہ ملتا ہے اور کامیابی کے راستہ کی طرف بار بار دعوت دی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فنا کر کے اور دوزخ میں ڈال کر خوش ہوتا تو بار بار کامیابی، مغفرت اور جنت کے راستہ کی طرف نہ بلایا جاتا۔

قرآن کا تصور خدا غضب، سختی اور انتقام پر مبنی ہے:

یہ اشکال پیدا کیا گیا ہے کہ قرآن نے جو تصورِ الٰہ پیش کیا ہے، یہ ظالمانہ ہے۔ غضبِ الٰہی اور سختی و انتقام پر مبنی ہے۔

پادری برکت اللہ نے "توضیح البیان فی اصول القرآن" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

قرآن کا اللہ ایک قادرِ مطلق سلطان ہے جو ایک ذمہ دار ہستی نہیں بلکہ اللہ جو چاہے حکم دے (مائدہ آیت نمبر ۱) لہٰذا قربانیوں کے وسیلہ سے اسے خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن مسیحیت کا خدا محبت کا خدا ہے۔ وہ گناہ گاروں کی موت نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ گناہ گار اس کی طرف رجوع

---

[4] المومن ۴۰:۳۱

Al-Mu'min 40:31

[5] النساء ۴:۱۴۷

An-Nisa 4:147

کرے جس طرح دنیاوی باپ کی محبت اور دنیاوی ماں کی مامتا اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کا نافرمان بیٹا ان کی جانب رجوع کرے اور اس بات کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔اِسی طرح خدا کی محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ ہر ممکن طور پر گناہ گاروں کو اپنی طرف لائے۔[6]

اس سے پہلے پادری مذکور نے یوں بیان کیا ہے۔

اسلام کا اللہ حی القیوم، قادر مطلق، خود مختار سلطان اور رعیت، آقا اور غلام کا تعلق ہے۔ خدا اور اس کی مخلوق میں باپ اور بیٹے کا تعلق نہیں۔ اگر اللہ مہربان، غفار اور الرحمن الرحیم ہے تو اپنی پدرانہ شفقت اور ازلی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ خسروانہ عنایات کی وجہ سے ہے۔ اگر آقا چاہے تو اپنے غلام کو معاف کرے اگر چاہے تو سزا دے۔ سب کچھ اللہ کی مطلق العنان مرضی پر منحصر ہے جس کو چاہے معاف کرے، جس کو چاہے عذاب دے۔(البقرہ ۲۸۴،آلِ عمران ۲۵، ۳۵،مائدہ ۴۴ وغیرہ)[7]

ان اقتباسات میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اور قرآن کا اللہ جو ہے وہ بندوں پر بہت سختی کرتا ہے۔ وہ جبار اور قہار ہے۔ عذاب دینے اور بدلہ لینے میں اپنی مرضی کا مالک ہے۔ عوام سے اُس کا تعلق آقا یعنی خود مختار بادشاہ کا سا ہے اور عوام اس کے آگے بطورِ غلام ہے۔

اس کے ساتھ یہاں یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ مسیحیت کا خدا محبت کا خدا ہے، وہ ذات گناہ گار کو اپنے قریب رکھتی ہے، اللہ اور بندے کی محبت کو باپ اور بیٹے کی محبت سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

ان بے بنیاد اشکالات میں سب سے پہلے تو ایک بڑی حقیقت کے خلاف بات کی گئی ہے کہ قرآن کا خدا، اسلام کا خدا اور مسیحیت کا خدا، یہ جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، یہ بالکل غیر حقیقی ہیں کیونکہ خدا تو سب کا ایک ہی ہے۔ صرف ایک معبود حقیقی اللہ جو کہ سب کا خالق و مالک ہے۔ اگر فرق ہے تو تصورِ خدا یا خدا کے بارے میں جو مختلف مذاہب کا عقیدہ ہے اس میں فرق ہے۔ لیکن تعصب کی انتہا ہے کہ ہر مذہب کا الگ خدا بنا دیا گیا ہے۔ جس سے توحید کی اگر کہیں مسیحیت میں کوئی نشانی تھی بھی وہ بھی اب جاتی رہی ہے۔

مزید یہ کہ یہاں خدائی ربوبیت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور باپ کی محبت سے اللہ کی محبت کو مشابہ قرار دیا گیا ہے، باپ (جو کہ ایک مخلوق ہی ہے) کی محبت کو رب کی محبت کے برابر سمجھنا خلافِ حقیقت ہی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ خالق جو کہ رب ہے، کی محبت کا مخلوق کی محبت ہزارواں حصہ بھی نہیں ہو سکتی۔

پادری صاحب کی اس بات پر بحث کرتے ہوئے مولانا ثناءاللہ امرتسری یوں بیان کرتے ہیں:

---

[6] برکت اللہ۔ **توضیح البیان فی اصول القرآن**۔لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب ۲۰۱۰ء، ص:۳۶

Barkatullah. *Tawdih al-Bayan fi Usul al-Quran*. Lahore: Al-Faisal Nashran wa Tajiran-e-Kutub, 2010, p. 36

[7] برکت اللہ۔ **مسیحیت کی عالمگیری**۔لاہور: نعمانی کتب خانہ ۲۰۱۱، ص ۳۰

Barkatullah. *Masihiyat ki Alamgeeri.* Lahore: Naumani Kutub Khana, 2011, p. 30

"آپ نے پدرانہ شفقت کو خدائی ربوبیت سے بالاتر سمجھا ہے، یہ غلط ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پدرانہ شفقت رب کی غیر محدود شفقت میں سے تسمہ بھر ہے، اور وہ بھی اس کی دی ہوئی (یعنی پدرانہ شفقت بھی تو اللہ کی عطا کردہ ہے)۔"[8]

اس بابت اگر قرآنِ مجید کی آیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت کس قدر ہے۔ قرآن میں اس بارے میں دوسرے ارشادات کے علاوہ اسمائے الٰہی ایسے بیان کیے گئے ہیں جن کے معانی سے اللہ کے اپنے بندوں پر رحم اور ان سے بے حد پیار کا اظہار ہوتا ہے جیسے الرحمن، الرحیم، الودود ، الرؤف وغیرہ۔

آئندہ سطور میں بندوں کے ساتھ خدا کی محبت کے ثبوت کو قرآنی آیات اور مفسرین کی آراء کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے۔

ایک مقام پر ارشادِ الٰہی ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ [9]

(خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان اور صاحبِ رحمت ہے۔)

مولانا عبدالماجد دریابادی یہاں یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد رحمت و شفقت عموم ہے یعنی تمام انسانیت کے لئے ہے۔ نیز "رؤف" میں "رحیم" سے بھی زیادہ رحمت اور محبت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں:

"خاص مومنین متعین پر تو حق تعالیٰ کا فضل و کرم ظاہر ہے ہی باقی یہاں ذکر عموم کے ساتھ کل بندوں پر شفقت و رحمت کا ہے اور اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں ایک نہیں متعدد ہیں۔

رَؤُفٌ الرَّحِيْم۔ماہرین زبان کا بیان ہے کہ رافت کا درجہ رحمت سے بڑھا ہوا ہے۔"[10]

ایک اور مقام پر یقین دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر مہربانی کرتے ہیں۔ خواہ لوگ ناشکرے ہی کیوں نہ ہوں۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ[11]

---

[8] امرتسری، ثناءاللہ۔ **اسلام اور مسیحیت**۔ لاہور: نعمانی کتب خانہ ۲۰۱۱، ص: ۱۶، ۱۷

Amritsari, Sanaullah. *Islam aur Masihiyat*. Lahore: Naumani Kutub Khana, 2011, pp. 16-17

[9] البقرہ ۲: ۱۴۳

Al-Baqarah 2:143

[10] دریابادی، عبدالماجد۔ **تفسیر ماجدی**۔ کراچی: مجلس نشریاتِ قرآن ۱۹۹۸، ج: ۱، ص: ۲۷۳

Daryabadi, Abdul Majid. *Tafsir Majidi*. Karachi: Majlis Nashriyat-e-Quran, 1998, Vol. 1, p. 273

[11] البقرہ ۲: ۱۴۳

Al-Baqarah 2:143

(اللہ تعالیٰ لوگوں کے حال پر مہربان ہے مگر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔)

اللہ تعالیٰ نے یہاں لوگوں پر اپنے فضل کو بیان کیا ہے۔ صرف فضل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ تخصیص اور زور دے کر "لذو فضل علی الناس" کے الفاظ لائے گئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل اور مہربانی کرنے والا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی انتہا کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی رحمت والے اسماء کے ساتھ زور دینے کے لئے "لام" کا استعمال ضرور کیا گیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں شروع میں "اِنَّ" کا آنا، پھر لذو فضل اور پھر علی الناس یہ سب اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ اللہ پاک کی ذات بہت مہربان ہے اپنے تمام بندوں پر۔ ادھر علی الناس کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عیسائیوں اور یہودیوں یا مسلمانوں کے لئے خاص نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے ہے۔ مزید یہ کہ شروع میں اِنَّ کو لا کر یہ یقین بھی دلا دیا کہ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت دیکھیں کہ وہ احکام الحاکمین، خالق رب العالمین ہو کر اپنے بندوں کو اپنی رحمت، فضل اور محبت کا یقین دلا رہا ہے۔ قرآن میں ایک جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات پر ایسا ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں اعتراض کرنے والے نے جو کہا ہے کہ قرآن کا اللہ (نعوذ باللہ) ذمہ دار ہستی نہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کا یا اہل قرآن کا اللہ ایک ہی ہے اور وہی یہود و نصاریٰ بلکہ تمام انسانیت کا ربّ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جو کہ نظامِ دنیا انتہائی عادلانہ اور رحمت کے انداز میں چلا رہی ہے، کے بارے ایسے الفاظ استعمال کرنا جہالت ہے۔

مولانا ثناءاللہ امرتسری نے اس پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

پس آپ کا یہ فقرہ کہ اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہستی نہیں بالکل غلط ہے کیونکہ ذمہ دار ہستی اس بادشاہ کی ہوتی ہے جو عدل و انصاف کرے اور اپنی مرضی سے کسی کی حق تلفی نہ کرے، قرآن مجید نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا[12]

(اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی نیکی ہو، اس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔)[13]

ایک اور مقام پر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے اپنے پیار کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ[14]

---

[12] النساء۴: ۴۰

An-Nisa 4:40

[13] امرتسری، ثناءاللہ، **اسلام اور مسیحیت**، ص: ۳۱

Amritsari, Sanaullah, *Islam aur Masihiyat*, p. 31.

(اور وہ بخشنے والا بھی ہے، محبت کرنے والا بھی ہے۔)

اس آیت سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ظالم لوگوں کو سزا دینے اور پکڑنے کے بارے میں سختی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اُس ذاتِ باری تعالیٰ کو پکڑنے یا عذاب دینے کا شوق نہیں بلکہ وہ تو اپنی مخلوق سے بڑا پیار کرنے والا اور بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔ کوئی اپنی جان پر کتنا ہی ظلم کرے، گناہوں میں کتنا ہی ڈوب جائے۔ اُس ربِ کائنات کی طرف رجوع کر کے تو دیکھے، اُسے اپنی شہ رگ سے بھی نزدیک پائے گا۔ اُس کا گناہ گار بندہ توبہ کرے تو سہی، اس کے نہ صرف گناہ معاف کر دیئے جائیں گے بلکہ توبہ میں اخلاص کی وجہ سے گناہوں کو نیکیوں میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اس پر بات کرتے ہوئے مولانا مودودی نے یوں بیان کیا ہے۔

''بخشنے والا'' کہہ کر یہ امید دلائی گئی ہے کہ کوئی اگر اپنے گناہوں سے باز آ کر توبہ کرے تو اس کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتا ہے۔ ''محبت کرنے والا'' کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو اپنی خلق سے عداوت نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس کو مبتلائے عذاب کرے۔ بلکہ جس مخلوق کو اس نے پیدا کیا ہے اُس سے وہ محبت رکھتا ہے اور سزا صرف اُس وقت دیتا ہے جب وہ سرکشی سے باز ہی نہ آئے۔''[15]

مولانا شبیر احمد عثمانی یہاں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی باوجود اس صفتِ قہاری و سخت گیری کے اُس کی بخشش اور محبت کی بھی کوئی حد نہیں۔ وہ اپنے فرمانبردار بندوں کی خطائیں معاف کرتا، اُن کے عیب چھپاتا اور طرح طرح کے لطف و کرم اور عنایت و شفقت سے نوازتا ہے۔''[16]

اگر اللہ تعالیٰ کی صفات میں سختی ہے بھی تو یہ ایک خاص حد تک ہے اور مشروط ہے اور اُس کی اپنے بندوں سے شفقت اور پیار کی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ کے بندوں سے پیار اور اُن پر رحمت کے نزول کے سلسلہ میں کوئی اصول یا پابندی نہ ہے۔ یہ اُس کا خاص کرم ہے کہ اس نے سزا اور عذاب کو تو محدود کر کے اصولوں کے تابع رکھ دیا ہے اور اس کے لئے مزید رعایت توبہ کی رکھ دی کہ اگر عذاب کا حقدار ہونے کے باوجود بھی کوئی توبہ کرے تو اُس کے گناہ معاف کیے جائیں گے اور عذاب سے بچا لیا جائے گا۔

پادری صاحب نے اللہ تعالیٰ کی سختی، انتقام اور غضب کو ثابت کرنے کے لئے قرآن میں بیان کئے گئے اسمائے حسنیٰ جبار اور قہار کا سہارا لیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان اسماء کے مفہوم اور مدعا کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا ہے۔ ان اسماء کے مفاہیم پر غور کرنے سے ان میں بھی رحمت کا پہلو نظر

---

[14] البروج ۸۵:۱۴

Al-Buruj 85:14

[15] مودودی، ابوالاعلیٰ۔ **تفہیم القرآن**۔ لاہور: ادارہ ترجمان القرآن ۲۰۱۱، ج:۶، ص:۳۰۰

Maududi, Abu al-A'la. *Tafheem al-Quran*. Lahore: Idara Tarjuman-ul-Quran, 2011, Vol. 6, p. 300

[16] عثمانی، شبیر احمد۔ **تفسیر عثمانی**۔ لاہور: لائف گارڈ پرنٹرز، 4 ٹیپ روڈ ۲۰۱۰، ص:۷۷۶

Usmani, Shabbir Ahmad. *Tafseer Usmani*. Lahore: Lifeguard Printers, 4 Tape Road, 2010, p. 776

آتا ہے۔ الجبار۔ قرآن میں اسمِ الٰہی، الجبار کا ذکر مختلف مقامات پر ملتا ہے۔ سورۃ حشر کی آخری آیات میں دوسرے اسماء الحسنیٰ کے ساتھ ''الجبار'' کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مراد بظاہر تو سختی نظر آتی ہے لیکن اس سختی کا مقصد انسان کی اصلاح اور بھلائی ہے۔

اس کی وضاحت میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''اصل میں لفظ ''الجبار'' استعمال ہوا ہے، جس کا مادہ جبر ہے، جبر کے معنی ہیں۔ کسی شے کو طاقت سے درست کرنا، کسی چیز کی بزور اصلاح کرنا، اگرچہ عربی زبان میں کبھی جبر محض اصلاح کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور کبھی صرف زبردستی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا حقیقی مفہوم اصلاح کے لئے طاقت کا استعمال ہے۔''[17]

مولانا مودودیؒ نے یہاں واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر بندے پر سختی کرتے ہیں تو اس کا مقصد بندے کا نقصان ہر گز نہیں بلکہ اس کی اصلاح کی خاطر ایسا ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان نیکی کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے اور وہ سیدھے راستے سے تھوڑا ہٹ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تکلیف یا جھٹکا لگتا ہے تو آدمی سنبھل جاتا ہے۔ یہی مقصد قرآن میں مذکورہ عذاب، انتقام اور سختی سے متعلقہ آیات کا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ انسان غلط روش کو چھوڑ کر اعمالِ صالح کی طرف راغب ہو جائے اور اپنی بھلائی کا سامان پیدا کرے۔

پیر کرم شاہ الازہریؒ نے اس بات کو مزید واضح کر دیا ہے:

"الجبار، المصلح امور خلقه التصرف فيهم بما فيه صلاهحم" یعنی اپنی مخلوق کے امور کو درست کرنے والا اور ان میں ایسا تصرف کرنے والا جس میں ان کی فلاح اور بہبود ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہ جبر سے مشتق ہو گا جس کا معنی اصلاح ہے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی پر پٹی باندھ کر اسے درست کرنے کو بھی جبر کہتے ہیں۔ "جبرت العظم فجبر" اس کا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ جس کی سبطوت کو برداشت نہ کیا جائے۔[18]

پیر کرم شاہ صاحب نے ادھر بات کو مزید واضح کر دیا ہے اور اسم الٰہی ''الجبار'' میں پائی جانے والی سختی کو زخم کے اوپر لگائی جانے والی پٹی کی تکلیف سے مشابہ قرار دیا ہے۔، زخم پر پٹی لگانے سے اگرچہ شروع میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد زخم کی بہتری ہوتا ہے اور اس سے زخم بہتر ہو بھی جاتا ہے۔

ہر کام کرنے اور سنورنے میں یہی اصول اور طریقہ کار فرما ہے۔ اگر بناؤ کرنا اور سنورنا ہے تو پہلے توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرنا ہو گا۔ سونا آگ کی بھٹی سے گزر کر ہی کندن بنتا ہے۔ قرآنی احکامات عبر و نصائح اور وعید میں اگر کہیں سختی ہے تو صرف اور صرف انسانی بھلائی اور فائدے کے لئے ہے۔ جنت کی امید دلانا، دوزخ کی ہولناکیوں سے ڈرانا، عذاب و انتقام الٰہی سے ڈرانا، اللہ کی رحمت کی امید دلانا اور بار بار یہ کہنا کہ اس کی رحمت سے کبھی بھی نا

---

[17] مودودی، ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، ج:۵، ص:۴۱۵

Maududi, Abu al-A'la, *Tafheem al-Quran*, Vol. 5, p. 415

[18] الازہری، محمد کرم۔ **ضیاء القرآن**۔ لاہور: ضیاء القرآن پبلیکیشنز ۲۰۱۱، ج:۵، ص:۱۸۶

Al-Azhari, Muhammad Karam. *Zia-ul-Quran*. Lahore: Zia-ul-Quran Publications, 2011, Vol. 5, p. 186.

امید نہ ہونا اور توبہ کی بار بار رغبت دلانا یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر نرمی پر مبنی احکامات ہوں تب تو رحمت ہیں ہی حقیقت یہ ہے کہ اُس ذاتِ باری تعالیٰ کے سخت احکامات میں بھی انسان کے لئے بھلائی، رحمت اور مصلحت کے کئی عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن کا مکمل طور پر انسان ادراک نہیں کر سکتا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ''اسلام اور مسیحیت'' میں پادری برکت اللہ کے پیدا کیے گئے اشکالات کے جواب میں اسمائے الٰہی (الجبار اور القہار) کی وضاحت میں اس طرح لکھا ہے۔

''خالق اور مخلوق کا تعلق جیسا قرآنِ مجید نے بیان کیا ہے، اس سے اچھا تو کیا اس کے برابر بھی کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ آپ نے قرآن کی کمی اور نقص بتاتے ہوئے خدا کے متعلق جابر اور قاہر دو لفظ منتخب کئے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ ان عربی لفظوں کا ترجمہ کسی عربی دان پادری سے پوچھ لیتے تو آپ سے یہ غلطی سرزد ہو کر موجبِ ندامت نہ ہوتی۔ جابر جبر سے مشتاق ہے جس کے معنی اصلاحِ حال کے ہیں۔ جبیرہ مرہم والی پٹی کو کہتے ہیں جو زخم پر لگائی جاتی ہے کیونکہ وہ بھی اصلاح ہوتی ہے۔ اس لیے احادیث کی دعاؤں میں ایک لفظ ''واجبرنی'' بھی آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ اے خدا میری حالت سنوار دے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ خدا جابر ہے۔

قاہر کے معنی ضابط کے ہیں۔ ضابط اس بادشاہ کو کہتے ہیں جس کی رعایا سرتابی نہ کر سکے۔ یہ صرف خدا کی ذات میں علی وجہ کمال پایا جاتا ہے۔[19]

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کی انسان پر سختی بھی اس کے لیے فائدہ اور مصلحت ہی رکھتی ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ آدمی راہِ ہدایت کو نہ چھوڑے۔

تقابلی بحث

قرآنی تصور الٰہ کے بارے میں ایسے اعتراضات تو لگا دیئے جاتے ہیں لیکن بائبل کی اس بابت تعلیمات پر غور نہیں کیا جاتا کہ کیا بائبل میں بھی عذاب، انتقام اور خدائی غضب کا ذکر ملتا ہے۔

اس بابت بھی علامہ برکت اللہ نے حقائق سے آنکھ چرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی تالیف ''توضیح البیان فی اصول القرآن'' میں لکھتے ہیں۔

''مسیحیت کا خدا محبت کا خدا ہے، وہ گناہ گار کی موت نہیں چاہتا''[20]

---

[19] امرتسری، ثناء اللہ، **اسلام اور مسیحیت**، ص: ۸۵

Amritsari, Sanaullah, *Islam aur Masihiyat*, p. 85

[20] برکت اللہ، علامہ، **توضیح البیان فی اصول القرآن**، ص: ۱۷

Barkatullah, Allama, *Tawdih al-Bayan fi Usul al-Quran*, p. 17.

بائبل کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے اس بیان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہے کیونکہ بائبل میں تو معمولی سی غلطی پر جہنم کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔

بائبل میں یوں بیان ہوا ہے:

And whosoever shall say; Thou fool, shall be in danger of hell fire.[21]

(جو کوئی اپنے بھائی کو احمق کہے گا وہ آگ کی جہنم کا سزاوار ہو گا۔)

انجیل میں اتنا الٰہی غضب بیان کیا گیا ہے کہ گناہ یا جرم کا ارتکاب کیا نہیں، صرف احمق کہنے اور بری نظر سے دیکھنے کی وجہ سے گناہ گار کو ہمیشہ کے لئے جہنم کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے۔ مزید غضب یہ ہے کہ ادھر کوئی دوسری صورت بھی نہیں بتائی کہ جس سے گناہ گار اپنا یہ گناہ معاف کروا سکے۔ قرآن میں تو ایسا جہاں بھی ذکر آیا تو ساتھ "اِلّا مَن تَابَ" کا ذکر کر کے گناہ گاروں کو ضرور تسلی دی گئی کہ جو توبہ کرے گا اس کو ایسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

بائبل کے تصورِ خدا کے تحت خدا کی محبت کی مثال تو پہلے گزر چکی ہے۔ اب قرآنی تصور کے تحت اللہ کی اپنے بندوں سے محبت کی صرف ایک ہی مثال پیش کی جاتی ہے جو قرآنی تصور رحمت و عدلِ الٰہی کو سمجھنے میں کافی ہو جائے گی۔

ارشادِ ربانی ہوتا ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ[22]

میرے جن بندوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیے ہیں، ان کو کہہ دو کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ کیونکہ تمہاری ذرا سی انابت پر اللہ سب گناہ بخش دے گا، بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

یہ ہے قرآنی تصورِ الٰہ جس میں اللہ کی اپنے بندے سے محبت کو بیان کیا گیا کہ وہ بندے جو گناہِ کبیرہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر چکے، اُن کو بھی خاص نسبت سے یعنی میرے بندے کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو کئی طرح کی تسلی دی جا رہی ہے کہ پہلی بات یہ کہ میری رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ دوسری یہ کہ توبہ کرنے پر سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ مزید تسلی دے دی کہ وہ ذات (اللہ تعالیٰ) بڑی گناہوں کو بخشنے والی اور بڑی ہی رحم کرنے والی ذات ہے۔

---

[21] Mathew 5:22

[22] الزمر ۳۹:۵۳

Az-Zumar 39:53

مولانا مودودیؒ نے اس بابت یہ بات واضح کی ہے کہ یہاں خطاب تمام انسانوں کو ہے۔ خصوصاً یہاں ان لوگوں کو امید دلائی جارہی ہے جو گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کر کے مایوس ہو چکے ہوں کہ اب ان کی بخشش نہیں ہو گی۔ ایسے لوگوں کو کہا جارہا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ اس کی طرف پلٹو تو سہی، وہ تو سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔[23]

پیر کرم شاہ الازہری نے اس کی وضاحت میں کہا ہے:

اس آیت طیبہ مبارکہ میں بھی ان لوگوں کو نویدِ رحمت دی جارہی ہے جو عمر بھر اپنے اوپر زیادتیاں کرتے رہے، جن کے شب و روز فسق و فجور میں بسر ہوتے رہے، جنہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو بالکل برباد کر دیا۔ ایسے لوگوں کو کہا جارہا ہے کہ آؤ میری رحمت کا دروازہ تمہارے لیے کھلا ہوا ہے۔ اگر تم سچے دل سے تائب ہو کر نئی اور پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو تمہارے گناہ بے شمار اور نہایت سنگین کیوں نہ ہوں معاف کر دیئے جائیں گے۔ تمہیں یہاں سے مایوس نہیں لوٹایا جائے گا۔[24]

یہ ہے قرآنی تصورِ الٰہ کے تحت اللہ کی اپنے بندے سے محبت کہ گناہِ کبیرہ اور ظلم میں ملوث لوگوں کو توبہ اور معافی سے بالکل مایوس کر کے ہمیشہ کے لئے غضبِ الٰہی اور جہنم کا سزاوار قرار دینے کی بجائے ان کو بڑے ہی محبت بھرے لہجے میں اللہ اور بندے کے درمیان نسبت کا حوالہ دے کر کہا جارہا ہے کہ اے میرے بندو! کبھی بھی مایوس نہ ہونا، میں تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس اصطلاح ''اے میرے بندو'' سے مراد یہ لیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت اور پیار کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں نسبت اور تعلق کا بڑا اثر ہے۔ جس طرح ایک باپ اپنے بچوں کو جب میرے بچے کہہ کر بلائے تو وہ زیادہ اطمینان اور خوشی سے باپ کی طرف آئیں گے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انتہائی پیار سے ''اے میرے بندو'' کہہ کر پکارا ہے۔ تاکہ اُن کو تسلی رہے اور مایوسی سے بچ جائیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس بابت جو بڑی واضح انداز میں حضرت جعفر صادق کے بیان کے حوالے سے بات کی ہے، ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں جہاں کہیں خدا نے گناہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہے یا ان کا ذکر کیا ہے۔ تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔ "قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ " "ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ " (۲۵:۱۷) اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوشِ محبت میں اپنے بیٹے کو پکارتا ہے، تو خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتۂ پدری پر زور دیتا ہے۔ ''اے میرے بیٹے، اے میرے فرزند'' حضرت امام جعفر صادق نے سورۃ زمر کی آیتِ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے کیا خوب

---

[23] مودودی، ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، ج: ۴، ص: ۳۸۰

Maududi, Abu al-A'la, *Tafheem al-Quran*, Vol. 4, p. 380

[24] الازہری، محمد کرم، **ضیاء القرآن**، ج: ۴، ص: ۲۷۸

Al-Azhari, Muhammad Karam, *Zia-ul-Quran*, Vol. 4, p. 278

فرمایا ہے "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں، کیونکہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ہم ان پر غضبناک نہیں۔ قرآن میں خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں عبادی کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور بڑے سے بڑے گناہ گاروں کو بھی یٰعِبَادی کہہ کر پکارا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر اس کی آمرزش و رحمت کا کوئی پیام ہو سکتا ہے؟[25]

اسلام میں خوف کا عنصر وحشی اقوام کے دیوتاؤں کے خوف کی طرح ہے:

تصورِ الٰہ کے حوالے سے یہ بھی اعتراض سامنے آیا ہے کہ اسلام میں خوف کا عنصر وحشی اقوام کے دیوتاؤں کے خوف کی طرح ہے۔

علامہ برکت اللہ نے اس طرح لکھا ہے:

"اسلام میں خوف کا عنصر اسی طرح کارپرداز ہے جس طرح وحشی اقوام کے مذاہبِ باطلہ میں دیوتاؤں کا خوف کام کرتا ہے۔"[26]

مزید پادری صاحب نے لکھا ہے۔

"حق یہ ہے کہ جس قدر کسی مذہب میں دہشت کا عنصر غالب ہوگا اسی نسبت سے وہ مذہب ادیانِ عالم میں ادنی پایہ کا شمار کیا جائے گا۔

ان اقتباسات سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اس طرح مسیحیت کے علاوہ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام کے خلاف اس موضوع سے متعلق بے بنیاد اشکالات پیدا کیے جا رہے ہیں کیونکہ جب عمومی طور پر خوف کی جبلت کی بات کی جاتی ہے تو یہ کہنا کہ خوف کی جبلت تمام جانداروں کے لئے ضروری ہے۔

جیسا کہ ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

"خوف کی جبلت تمام حیوانات کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ انسانی سرشت میں یہ جبلت قوی ترین جبلتوں میں سے ہے۔"[27]

جب خوف کی جبلت کی عمومی بات کی جائے تو یہ بقا کے لئے ضروری ہے لیکن اسلام میں اس جبلت کے بارے بات کی جائے تو اس ذریعہ سے اسلام کو ادنی اور دہشت پھیلانے والا قرار دینا بھی ناانصافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں سختی اور ڈر پر مبنی جو احکامات بیان ہوئے ہیں ان کا مقصد خوف پیدا کرنا ہرگز نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان فلاح کا راستہ اختیار کرے۔ صرف ڈر سے متعلقہ احکامات ہی نہ ذکر ہوئے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ مغفرت، رحم اور تبشیر کے احکامات بھی ذکر کیے گئے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآنی تعلیمات اور احکامات کا مقصد انسان کو ہراساں کرنا نہیں بلکہ کامیابی اور فلاح کے راستہ کی طرف لانا ہے۔

---

[25] آزاد، ابوالکلام احمد۔ **اُمُّ الکتاب**۔ لاہور: مکتبہ احباب ۲۰۰۸، ص: ۱۶۱، ۱۶۲

Azad, Abu al-Kalam Ahmad. *Umm-ul-Kitab*. Lahore: Maktaba Ahbab, 2008, pp. 161-162

[26] برکت اللہ۔ **دینِ فطرت اسلام یا مسیحیت**۔ لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب ۲۰۱۱، ص: ۲۵

Barkatullah. *Deen-e-Fitrat: Islam ya Masihiyat.* Lahore: Al-Faisal Nashran wa Tajiran-e-Kutub, 2011, p. 25

[27] برکت اللہ، **دینِ فطرت اسلام یا مسیحیت**، ص: ۲۹

Barkatullah, *Deen-e-Fitrat: Islam ya Masihiyat*, p. 29

تقابلی بحث

دوسروں پر بے بنیاد الزامات عائد کرنے سے پہلے اس بابت اپنی تعلیمات اور نظریات پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ مسیحیت نے یہ نہیں دیکھا کہ خود اس کی تعلیمات میں کس قدر خوف، دہشت، غضبِ الٰہی اور عذابِ جہنم کا ذکر ملتا ہے۔

پادری برکت اللہ مسیحیت کا طرۂ امتیاز بتاتے ہوئے بائبل کی اس سلسلہ میں تعلیمات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ خداوند کا خوف دانش کی ابتداء ہے (امثال ۱:۷) خداوند کا خوف پاک ہے (زبور ۱۹:۹)، خداوند تمہارا، تم سے سوائے اس کے اور کیا چاہتا ہے کہ تم اپنے خداوند کا خوف مانو اور اس کی سب راہوں پر چلو اور اس سے محبت رکھو (استثناء ۱۰:۱۲)

مزید علامہ برکت اللہ نے اپنی تالیف میں لکھا ہے:

"یہ خوف دانش کی ابتداء اور پاک ہے۔ اس سے خدا کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

تعصب سے پاک اور عدل پر مبنی بات ہی اثر رکھتی ہے۔ اسلام کی اس بابت تعلیمات جو کہ اعتدال پر مبنی ہیں کو وحشیانہ کہنا حقیقت سے منہ موڑنا ہے۔ اس کے برعکس بائبل کی خدا کے غضب اور انتقام سے متعلقہ تعلیمات کو بھی اسلام پر اشکالات پیدا کرنے سے پہلے پڑھ لینا چاہیے۔

بائبل میں انجیل کی کتاب خروج میں ہے:

(وہ ہر حال میں گناہ گار کو معاف نہ کرے گا بلکہ باپوں کے گناہ کا ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک بدلہ لے گا۔)[28]

اسلام میں تو اعتدال کے پہلو کو ہر معاملہ میں ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ خوفِ خداوندی کے مسئلہ میں بھی اعتدال نظر آتا ہے، نہ ہی بالکل کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو مرضی کرتے پھریں، کوئی پوچھ گچھ نہیں اور نہ ہی زیادہ دہشت کا سماں پیدا کیا گیا ہے بلکہ سزا اور جزا کو ساتھ ساتھ رکھ کر سب سے بڑی بات یہ کہ رحمت، مغفرت اور توبہ کو بھی ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے۔

ایک مقام پر ارشادِ ربانی ہوتا ہے۔

"نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ"[29]

(اے پیغمبر ﷺ! میرے بندوں کو یہ اطلاع دے دو کہ میں بڑا ہی بخشن ہار اور مہربان ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ مجرموں کے لئے میرا عذاب بڑا ہی دردناک ہے۔)

---

[28] کتابِ مقدس، **عہد نامہ قدیم**، خروج ۳۴:۶، ۷

Kitab-e-Muqaddas, *Old Testament*, *Exodus* 34:6-7

[29] الحجر ۱۵:۴۹، ۵۰

Al-Hijr 15:49-50

قرآن نے یہ انتہائی معتدل کلام پیش کیا ہے جس میں خوف اور محبت دونوں چیزوں کو اعتدال پر رکھا گیا ہے۔ یہاں بھی '[عبادی" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جو کہ اللہ کے اپنے بندے کے ساتھ پیار کی انتہا کو ظاہر کرتی ہے۔ صرف "عبادی" پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ "الغفور" اور "الرحیم" دونوں نام ہی ایسے لاکر رکھ دیئے جس سے اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت اور اپنے بندوں پر رحمت اور ان کی مغفرت کا اثبات ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ بعد والی آیت میں جو سختی نظر آرہی ہے، یہ بھی انسان کی بھلائی کے لئے ہی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بندے یہ سمجھ کر کہ ہمارے تو گناہ بخش دیئے جائیں گے، نافرمانیوں اور ظلم میں مبتلا ہو کر شریف انسانیت کا جینا دوبھر نہ کر دیں۔

قرآن نے ہمیشہ بیم ورجا کا درس دیا ہے۔ رب تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کی وجہ سے مومن کے دل میں رجا (امید) کا عنصر پایا جارہا ہے جبکہ بیم (ڈر) کے انسانی دل میں پائے جانے سے یہ نہیں لازم آتا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ڈرانا یا عذاب سنانا مراد ہے بلکہ بندوں کی خطاؤں کی وجہ سے مومن کا دل خود بخود کانپ اُٹھتا ہے کہ کہاں میں گناہ گار اور کہاں مجھ عاصی پر اتنا بڑا فضل واحسان۔

اس بابت مولانا عبدالماجد دریابادی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

مومن کی شان جو حدیث میں بتائی گئی ہے، کہ اس کا قلب ہمیشہ بیم ورجا، خوف ورجا کے درمیان رہتا ہے، اس کی بنیاد ان ہی صفاتِ الٰہی پر ہے۔ بندہ جب خدائے آمرزگار کی رحمت بیکراں اور مغفرت بے پایاں پر نظر کرتا ہے تو اُسے ہر طرف امید ہی امید نظر آتی ہے لیکن جب نظر اپنی کوتاہیوں، لغزشوں اور خطاؤں کی طرف جاتی ہے تو قلب کا خشیتِ الٰہی سے تھر تھرا جانا بھی بالکل قدرتی اور صحیح ہے۔ البتہ دونوں صفات کے درمیان فرق اور اہم فرق یہ ہے کہ مغفرت اور رحمت مطلق ہے، مستحق، غیر مستحق، سب کے لئے عام ہے۔ بہ خلاف اس کے عذاب وعتاب محدود ومخصوص ہے، صرف مستحقین کے لئے ہے، یہ ناممکن ہے کہ کوئی غیر مستحق عذابِ الٰہی کا شکار ہو جائے لیکن یہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ واقع بھی ہو گا کہ کتنے ہی قابلِ تعزیر، بدکار، بدکردار، بدعمل، محض مغفرتِ الٰہی سے بخش دیئے جائیں گے۔ یہی راز ہے اس کا کہ قرآن بھر پڑھ جایئے، اسمائے حسنیٰ الغفور، الودود، العفو، الرحیم، الرؤف، الرحمن، الغفار، التواب، و غیربا صد ہا مقامات پر ملیں گے۔ بہ خلاف اس کے المعذب، المؤلم وغیرہ ہیں ایک جگہ بھی نہ ملے گا۔[30]

بائبل کی کتاب خروج میں جو بیان کیا گیا ہے کہ خداوند گناہ گار کو ہر گز نہ چھوڑے گا اور ایک گناہ گار کے گناہ کا بدلہ اس کے بیٹوں اور پوتوں سے لیا جائے گا، یہ سراسر ظلم اور عدل وانصاف کے منافی چیز ہے۔ ایسا تصور خدا ہی اصل میں ظالمانہ اور دہشت وغضب پر مبنی ہے کہ ایک گناہ گار کو اور اُس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی گناہ کا عذاب ہو سکتا ہے اور ساتھ معافی یا توبہ کی راہ بتائی ہی نہیں جبکہ اسلام میں جہاں بھی گناہ گاروں کے بڑے بڑے گناہوں کی وجہ سے عذاب یا دوزخ میں داخلے کا ذکر آیا تو اس کے ساتھ "اِلَّا مَنْ تَابَ" کے الفاظ ضرور آئے ہیں، یعنی جنہوں نے توبہ کی ان کے علاوہ دوسرے ظالم لوگوں کو ہی عذاب ہو گا۔ اس کے علاوہ ایک کا گناہ دوسرے کے ذمہ ڈال دینا، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ قرآن کے تصورِ الٰہ اور سزا وجزا

---

[30] دریابادی، عبدالماجد، **تفسیر ماجدی**، ج: ۲، ص: ۷۴۳

Daryabadi, Abdul Majid, *Tafsir Majidi*, Vol. 2, p. 743

کے تحت ایسا ہر گز نہ ہے۔ قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور ایک کا بوجھ دوسرے پر نہ ڈالا جائے گا۔

ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى"[31]

(اور کوئی جان نہیں اٹھائے گی کسی دوسری جان کا بوجھ۔)

ایک مقام پر یہ بھی فرمادیا کہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔

ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[32]

(اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق)

مزید مفسرین نے اس کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔

مولانا مودودیؒ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بوجھ سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے، مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔''[33]

اسی وجہ سے مفکرین نے لکھا ہے کہ عدل کے اثرات و نتائج رحم اور مہربانی کی صورت میں سامنے آتے ہیں کیونکہ یہ ظلم کی ضد ہے۔ ایک انسان کے کیے کی سزا دوسرے پر عائد کر دینا کھلم کھلا خلافِ عدل نظر آرہا ہے اور جو چیز خلافِ عدل ہو وہ ظلم کے زمرے میں آئے گی۔

قرآن کی تعلیمات کی سختی کی وجہ سے اللہ اور بندے کے درمیان تعلق میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے:

مسیحیت کی جانب سے پیدا کردہ اشکالات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف مذاہب خصوصاً اسلام نے تصورِ الٰہ سے متعلقہ ایسی ظلم، جبر، سختی اور دہشت پر مبنی تعلیمات دی ہیں جن کی وجہ سے اللہ اور بندے کا جو گہرا تعلق تھا اس میں قربت آنے کی بجائے ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ دہشت پر مبنی تعلیمات کی وجہ سے اللہ اور بندے کے درمیان جو تعلق تھا وہ اب جاتا رہا ہے۔

---

[31] فاطر ۳۵:۱۸

Fatir 35:18

[32] البقرہ ۲:۲۸۶

Al-Baqarah 2:286

[33] مودودی، ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، ج ۴، ص ۲۲۸

Maududi, Abu al-A'la, *Tafheem al-Quran*, Vol. 4, p. 228

اس بابت پادری صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

"اسلام نے خدا کے متعلق یہ تعلیم دی ہے کہ خدا اپنی مخلوقات سے بلند و بالا ہے۔ (نحل ۶۲)، نساء ۳۸ وغیرہ) اور اس صداقت کے عنصر پر اس قدر زور دیا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی ہے۔ مسیحیت میں بھی یہ تعلیم موجود ہے کہ خدا کائنات سے بلند و بالا ہے۔ (زبور ۱۸: ۳۸)، اعمال ۷: ۴۹ وغیرہ) لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ناقص پہلو کو اپنے اندر لے کر اس نے خدا اور انسان میں کوئی خلیج پیدا نہیں کی۔ خدا کے بلند و بالا ہونے اور اس کے حاضر و ناظر ہونے میں جو صداقت کے پہلو ہیں وہ مسیحیت میں نہایت دلکش اور پسندیدہ حالت میں موجود ہیں۔ اسلام نے خدا اور انسان کے درمیان خلیج پیدا کر کے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا فرشتوں کے ذریعے انسان سے کلام کرتا ہے اور یوں اپنی مرضی انسان پر ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن جبرائیل فرشتہ کے ذریعہ سے رسولِ عربی ﷺ پر نازل کیا لیکن مسیحیت یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے جس کی ذات محبت ہے، لہٰذا اس اور انسان میں کوئی خلیج واقع نہیں۔"[34]

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ ذات مخلوق سے بلند و بالا ہے۔ قرآن کی ایسی تعلیمات پر تو فخر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کا خالق، رازق، مالک ہے تو وہی سب سے بلند و بالا ہے لیکن یہ بات کہنا کہ اللہ اور بندے کے درمیان پیغام رسانی کے لئے فرشتہ جبرئیلؑ کو مامور کرنا گویا اللہ اور بندے کے درمیان تعلق میں دوری اور خلیج حائل کرنا ہے۔ سراسر خلافِ عدل اور خلافِ عقل ہے۔ اس ضمن میں تو بائبل بھی ایسی ہی تعلیم دیتی ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ سے پہلے انبیاء کی طرف بھی حضرت جبرائیلؑ ہی وحی لے کر آتے رہے ہیں۔ چنانچہ بائبل شہادت دیتی ہے کہ حضرت لوطؑ کی قوم پر عذاب لانے والے فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے، اس کے علاوہ حضرت زکریاؑ کے پاس خدا کا فرشتہ آیا اور ان کو بیٹے کی خوشخبری دی۔ مزید یہ کہ خود مسیحیت میں بھی ایسی تعلیم ملتی ہے۔

بائبل میں یوں بیان ہوا ہے:

And in the sixth month, the angel Gabriel was sent from God into a cith of Galilee, called Nazareth. To a virgin espoused to a man whose name was Joseph, of the house of David; and the virgin's name was Mary: And the angel being comein, said unto her: Hail.[35]

(چھٹے مہینے جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے جلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرت تھا بھیجا گیا۔ ایک کنواری کے پاس جس کی یوسف نامی ایک فرد سے منگنی ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ اس فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا۔ اے پسندیدہ سلام)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے انبیاء پر بھی وحی فرشتوں کے ذریعہ سے آتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی ذات بلاواسطہ کلام نہ کرتی تھی، اس کا مطلب یہ ہر گز نہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق میں کمی آگئی ہے۔

---

[34] برکت اللہ، **مسیحیت کی عالمگیری**، ۱۴۰، ۱۰۳

Barkatullah, *Masihiyat ki Alamgeeri*, pp. 103, 140

[35] *Luke* 1:26-28

اللہ اور بندے کے تعلق کی گہرائی کو جتنا قرآن نے واضح کیا ہے اتنا کسی اور الہامی کتاب نے واضح نہ کیا ہے۔ قرآن تو بندوں کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر اُس جگہ موجود ہے جہاں بندہ موجود ہے۔ یعنی وہ ذاتِ پاک ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔

ارشادِ الٰہی ہوتا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ[36]

(وہ (اللہ تعالیٰ) ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے۔)

ایک اور مقام پر اللہ اور بندے کے تعلق کو مزید واضح کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہوتا ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ [37]

(اور ہم (اللہ تعالیٰ) انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔)

ان آیات کے مفاہیم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر وقت انسان کے ساتھ ہے۔ انسان جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ کی ذات ہر وقت اُس کے ساتھ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے پیار کی وجہ سے اس کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا ہے۔ مزید اس سے بھی بڑھ کر تسلی کا اظہار دوسری آیت میں ہوتا ہے کہ جب احکام الحاکمین انسان کو کہہ دے کہ میں تیری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں تو اس سے زیادہ قربت اور پیار کا اظہار بھی کیا ہو سکتا ہے؟

اوپر جو سورۃ الحدید کی آیت بیان کی گئی ہے اس کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ نے بیان کیا ہے کہ انسان جہاں بھی ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات اس کے ساتھ ہے، سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم سے ہر وقت اپنے بندے کے لئے زندگی کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

اِس ضمن میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"جہاں بھی تم ہو، اللہ کو معلوم ہے کہ تم کہاں ہو، وہاں تمہارا زندہ ہونا بجائے خود اس کی علامت ہے کہ اللہ اُسی جگہ تمہاری زندگی کا سامان کر رہا ہے۔ تمہارا دل اگر دھڑک رہا ہے، تمہارے پھیپھڑے اگر سانس لے رہے ہیں، تمہاری سماعت اور بینائی اگر کام کر رہی ہے تو یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ اللہ کے انتظام سے تمہارے جسم کے سب کل پرزے چل رہے ہیں اور اگر کسی جگہ بھی تمہیں موت آتی ہے تو اسی وجہ سے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری بقا کا انتظام ختم کر کے تمہیں واپس بلا لینے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔"[38]

---

[36] الحدید ۵۷:۴

Al-Hadeed: 4:57

[37] ق ۵۰:۱۶

Kaf: 50:16

[38] مودودی، ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، ج:۵، ص:۳۰۵، ۲۰۴

Maududi, Abu al-A'la, *Tafheem al-Quran*, Vol. 5, pp. 305, 204

مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہاں سورۃ ''ق'' کی متذکرہ بالا آیت کی وضاحت میں لکھا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی رگ جان سے قریب اپنی ذات کو کہا ہے تو یہ قربت کی انتہا کا کامل ترین تصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل و کرم کی انتہا ہے کہ یہ قربت سب کے لئے ہے۔ خواہ کوئی نیک ہے یا بد۔ سب اس قربتِ الٰہی میں شامل ہیں۔ اس کا مقصد ان جاہل اور مشرک قوموں کی تردید بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کو بندوں سے بہت دور سمجھ بیٹھے ہیں۔ [39]

یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے کہ قرآن کے تصورِ الٰہ کے تحت اللہ اور بندے کے درمیان خلیج حائل ہو گئی ہے۔ وہ ذاتِ پاک تو ہر وقت اپنے بندہ کے ساتھ ہے اور اپنے بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ قرآن میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس ابہام کو مزید دور کر دیا ہے کہ میں اپنے بندے کی ہر پکار کا جواب دیتا ہوں۔ ہر وقت، ہر کام اور ہر مراد کے لئے مجھے ہی پکارا جائے۔

ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

''وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ'' [40]

(اور (اے نبی ﷺ) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجئے کہ) میں قریب ہوں، میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکاریں پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ صحیح راہ پر رہیں۔)

اس آیت کریمہ میں اللہ اور بندے کے درمیان محبت اور قربت کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس انداز سے شاید قرآن کے کسی دوسرے مقام پر بیان نہیں کیا گیا اور نہ اس سے پہلے کسی الہامی کتاب میں اتنی قربت ظاہر کی گئی ہے۔

پیر کرم شاہ الازہریؒ اس بابت ''ضیاء القرآن'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

کتنی پیاری آیت ہے ہجوم بلا میں، طوفانِ مصائب میں، گردابِ ہلاکت میں گھرے ہوئے شکستہ دل اور پریشان انسان کے لئے ان چند لفظوں میں اطمینان و سکون کا کیا روح پرور پیغام ہے۔ آپ غور فرمائیے۔ اِنِّی قریب کے دو لفظوں میں راحت و اطمینان کی ایک دنیا سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ کسی فصلِ بہار کی نسیمِ سحر میں، کسی ابرِ نیساں کے حیات بخش قطروں میں وہ اثر کہاں جو اثر ان دو لفظوں میں ہے۔ دُکھ، درد کا مارا جب یہ سنتا ہے کہ میرا مالک، میرا خالق مجھ سے الگ تھلگ کہیں دُور نہیں کہ اسے میرے حال کا علم نہ ہو۔ رنج و الم کی خبر نہ ہو، بلکہ وہ قریب ہے، بالکل قریب، نزدیک ہے، رگِ جاں سے بھی زیادہ نزدیک تو اسے کتنا قرار آجاتا ہے۔ تمہاری زبان پر آئی ہوئی بات تو کیا تمہارے دل میں منہ چھپائے ہوئے اسرار جو قوتِ گویائی کو اپنا چہرہ دکھانے سے شرماتے ہیں۔ افکار اور اندیشوں کے وہ نازک و لطیف آبگینے ان سب کو وہ جانتا ہے۔ وہ قادر بھی ہے، رحمٰن و رحیم بھی، تم دستِ دُعا دراز تو

---

[39] دریابادی، عبدالماجد، **تفسیر ماجدی**، ج:۷، ص:۲۰

Daryabadi, Abdul Majid, *Tafsir Majidi*, Vol. 7, p. 20

[40] البقرہ۲:۱۸۶

Al-Baqarah 2:186

کرو۔ تم دامنِ طلب پھیلا کر تو دیکھو، تم دل کے ہاتھوں سے اُس کے درِ رحمت پر دستک تو دو، وہ سنے گا تمہاری فریاد، وہ قبول کرے گا تمہاری دُعا۔ وہ بدل دے گا تمہاری بگڑی ہوئی قسمت۔ لیکن جب وہ کرم فرمائے تو سرکش نہ بن جانا۔ اسی طرح سرِ نیاز اس کے درِ اقدس پر جھکائے رکھنا۔ اسلام قبول کرنے پر جو ذمہ داریاں تم نے قبول کی تھیں، جو عہد تم نے باندھا تھا اس کو نباہتے رہنا، رشد و ہدایت پاجاؤ گے، کامیاب و کامران ہو جاؤ گے۔[41]

اس آیتِ کریمہ میں جس قدر اللہ اور بندے کے درمیان تعلق، قربت اور محبت کی گہرائی کو بیان کیا گیا ہے، اس کی پوری طرح وضاحت کرنا کسی مفسر یا عالم کے بس میں نہیں ہے۔ مختلف مفسرین نے قرآنِ مجید کی دوسری آیات کی تفسیر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس آیت کی تفسیر بھی بیان کی ہے۔ ان میں پیر کرم شاہ الازہری نے جو وضاحت کی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ سے تمام انسانوں کو یہ تسلی اور حوصلہ مل رہا ہے کہ اُن کا کوئی خالق، مالک، رازق اور پُرسانِ حال ہے جس کو پکارنے کے لئے ان کو نہ کوئی درخواست لکھنی پڑتی ہے اور نہ چل کر کہیں جانا پڑتا ہے۔ بلکہ وہ تو ان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اُس خالق کو پکارنے کے لئے کسی اونچی آواز کی بھی ضرورت نہ ہے، بلکہ وہ تو دِل کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ آیت میں پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ جب میرے بندے مجھے پکاریں یعنی مجھ سے دستِ سوال دراز کریں تو ان کو بتادینا کہ میں ان سے دور نہیں ہوں بلکہ یقیناً قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا ہر وقت جب بھی وہ مجھے پکارے، جواب دیتا ہوں۔ پس میرے بندوں کو چاہیے کہ وہ مجھ میں ہی امن و سکون تلاش کریں۔ مجھے چھوڑ کر جہاں بھی جائیں گے، ذلیل و خوار ہی ہوں گے۔ یہ سب ہدایات ان کے فائدے اور بھلائی کے لئے ہی دی جارہی ہیں تاکہ وہ ہدایت یاب ہو کر کامیاب و کامران ہوں۔

اس آیت میں رحمتِ الٰہی کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ یہاں تمام انسانوں کو دعوت دی گئی ہے، کسی نیک و بد، یا فرمانبردار یا نافرمان کی تخصیص نہیں رکھی گئی۔ کوئی اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرتا ہے یا نہیں، سب کو میرے بندے کہہ کر پکارا گیا ہے۔ آیت کے ہر حصے میں قربتِ الٰہی کا عنصر موجود ہے۔ لیکن "عبادی" میں جو چاشنی اور تعلق خاص کا پہلو موجود ہے، اس سے اللہ کی اپنے بندوں سے محبت اور قربت مزید واضح ہو جاتی ہے۔

مولانا مودودی نے اس بابت یہ وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا کے سب بادشاہوں یا دوسرے معبودانِ باطل کی طرف چل کر جانا پڑتا ہے اور عرضی سنانا پڑتی ہے اور یہ بے اختیار پھر بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف بادشاہوں کے بادشاہ، رب العالمین اور احکام الحاکمین سے مدد کے لئے صرف دل سے پکارنا بھی نہیں بلکہ دل میں عرضی کا خیال آنا ہی کافی ہے۔ ایسے میں وہ ذات نہ صرف سنتی ہے بلکہ ہر ایک خواہ کوئی اس کے احکامات کو مانتا ہے یا نہیں سب کی مدد بھی کرتی ہے اور اُن سے محبت کرتی ہے، اُن پر رحم کرتی اور قسمیں کھا کھا کر ان کی مدد کرتی اور ان کو تسلی دیتی ہے۔[42]

---

[41] الازہری، محمد کرم، **ضیاء القرآن**، ج: ۱، ص: ۱۲۶

Al-Azhari, Muhammad Karam, *Zia-ul-Quran*, Vol. 1, p. 126

[42] مودودی، ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، ج: ۱، ص: ۱۴۴

Maududi, Abu al-A'la, *Tafheem al-Quran*, Vol. 1, p. 144.

احادیثِ مبارکہ میں بھی اس بابت صراحت ملتی ہے نبی آخر الزمان ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اللہ اور بندے کے تعلق کی کیفیت اور اللہ کے بندوں سے پیار کو کئی مقامات پر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث زبانِ زدِ عام ہو گئی کہ اللہ کو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار ہے۔ مزید ایک جگہ پر یہ بھی آیا ہے کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرے اور اُس ذات سے محبت کرے اور اُس کی طرف جتنا چلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف اس سے زیادہ چل کر آئے گا۔ احادیث میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایسے فرمانبردار بندوں کے میں ہاتھ بن جاتا ہوں۔ اسی طرح سے محبت کا ذکر کئی پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔

اِس بابت مولانا امین احسن اصلاحی یوں بیان کرتے ہیں:

"فَاِنِّی قَرِیب" ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس لیے کہ خدا سے قرب و بُعد کا انحصار بندے کے اپنے دل کی حالت پر ہے۔ اگر بندہ خدا سے غافل ہے اور بے پرواہے تو اس سے زیادہ دور کوئی چیز بھی نہیں لیکن اگر وہ خدا کی طرف متوجہ رہے، اس کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرے اور اس کی آزمائشوں میں طلب صبر واستقامت کے لیے اسی کے آگے روئے اور گڑگڑائے تو خدا سے زیادہ قریب بندے سے کوئی چیز بھی نہیں۔ وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔[43]

اِس ساری متذکرہ بحث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بائبل کی تعلیمات کی وجہ سے اللہ اور بندے کے درمیان تعلق میں دوری پیدا ہوئی ہے یا قرآن نے کوئی ایسا تصورِ الٰہ پیش کر دیا ہے جس وجہ سے بندوں کے اندر ذاتِ الٰہی کے بارے میں خوف اور دہشت پیدا ہو گئی ہے۔ بائبل کی تعلیمات سے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ خداوند کا خوف دل میں رکھو اور مزید یہ کہ جو کوئی غلطی کرے وہ دوزخ میں ضرور ڈال دیا جائے۔ اس ضمن میں توبہ کی گنجائش دی ہی نہیں گئی اور نہ گناہوں کی معافی کا تصور موجود ہے۔ مزید یہ کہ ایک آدمی کے گناہ کی سزا بعد میں آنے والی کئی نسلوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے کو بار بار تسلی دی گئی ہے کہ تمہارا رب ہر وقت تمہارے ساتھ ہے، تم اس کو جب بھی پکارو گے تمہاری پکار کا جواب دیا جائے گا۔ اس نے تو قرآن میں بیس سے زیادہ بار اپنے گناہ گار بندوں کو یٰعِبادی کہہ کر اپنی خاص نسبت اور تعلق کا حوالہ دے کر اپنا پیار جتایا ہے۔ قرآن میں جب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے زیادہ پیار اور محبت کا اظہار کیا ہے تو نہ مسلمان کو مخاطب کر کے ایسا کہا، نہ مومن کا نام لے کر بلکہ "اے میرے بندو!" کہہ کر پکارا جس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے تمام بندوں سے خاص پیار کا اظہار ہوتا ہے۔

اس بابت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بھی قرآن کی رحمت و عدل سے متعلقہ آیات اور بائبل کی اس بارے میں تعلیمات پر بحث کرتے ہوئے خلاصہ میں یہی لکھا ہے کہ اللہ اور بندے کے تعلق کے درمیان خلیج پیدا کرنے والی کتاب قرآنِ مجید نہیں بلکہ بائبل ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری "اسلام اور مسیحیت" میں اس بابت یوں بیان کرتے ہیں:

---

[43] اصلاحی، امین احسن۔ **تدبر قرآن**۔ لاہور: فاران فاؤنڈیشن ۲۰۰۹، ج: ۱، ص: ۴۵۴

Islahi, Amin Ahsan. *Tadabbur-e-Quran.* Lahore: Faran Foundation, 2009, Vol. 1, p. 454

"اللہ اور بندے کے درمیان خلیج حائل کرنے والی پہلی کتاب بائبل ہے[44]

مولانا ثناءاللہ امرتسری کے اس بیان کے سیاق و سباق کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قرآن کے بارے میں پیدا کیے گئے اشکال کے جواب میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان دوری پیدا کرنے والی کتاب بائبل ہے، قرآن نہ ہے۔ قرآن تو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ بار بار اعلان کرتا ہے کہ میرے بندے میرے بارے پوچھیں تو بتادو کہ میں تو قریب ہوں اور ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں اور وہ اپنے بندوں خصوصاً گناہ گاروں کو زیادہ محبت سے راہِ فلاح کی طرف بلاتا ہے۔ اگر اُس ذات نے اپنے بندوں کو سزا اور عذاب سے ہی دوچار کرنا ہوتا تو قرآن میں بار بار انسان کو کفر و ضلالت سے راہِ ہدایت اور روشنی کی طرف نہ بلایا جاتا۔

خلاصہ بحث

قرآن میں بیان ہر مضمون ہی رحمتِ الٰہی کا پیغام دے رہا ہے کیونکہ اس کی تعلیمات کا مقصد ہی انسان کو گمراہی اور رسوائی سے نکال کر ہدایت، روشنی اور فلاح کی طرف لے کر جانا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کی تخلیق اور اس نظام کی ترتیب صرف انسان کے لیے عمل میں لائی گئی ہے جس کے لیے "سخر لکم" کے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ یہ سارا نظام صرف انسان کے لیے ترتیب دینے میں اللہ تعالیٰ کی انسان پر رحمت اور فضل ہے نہ کہ غضب و عتاب۔

دوسرے مذاہب خصوصاً مسیحیت کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کہ قرآن جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے وہ ایسی ہستی ہے جو بندوں پر قہر، ظلم اور جبر کرنے اور انہیں سزا دینے میں خوش ہوتی ہے جب کہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتب خصوصاً کے تصور میں صرف پیار، محبت اور احساس ہے۔ جب کہ دلائل و براہین کی روشنی میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ رحمت و عدل، سزا و جزا اور انتقام و غضبِ الٰہی کا تصور ہر مذہب میں موجود ہے لیکن اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس میں اس تصور کے تمام تر پہلوؤں کو انتہائی احسن، معتدل اور جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور رحمت کے پہلو کو واضح اور وسعت دی گئی ہے۔ ایسا کہنے میں کوئی ابہام نہ ہے کہ اس تصور کے تمام پہلوؤں میں خواہ انتقام، غضب اور عدلِ الٰہی کیوں نہ ہو، رحمتِ الٰہی کا عنصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

---

[44] امرتسری، ثناءاللہ، **اسلام اور مسیحیت**، ص: ۸۸

Islahi, Amin Ahsan. *Tadabbur-e-Quran.* Lahore: Faran Foundation, 2009, Vol. 1, p.

حواشی

آزاد، ابوالکلام احمد. (2008). **اُمّ الکتاب**. لاہور: مکتبہ احباب

Azad, Abul Kalam Ahmad. (2008). *Umm-ul-Kitab*. Lahore: Maktaba Ahbab.

امرتسری، ثناءاللہ. (2011). **اسلام اور مسیحیت**. لاہور: نعمانی کتب خانہ

Amritsari, Sanaullah. (2011). *Islam aur Maseehiyat*. Lahore: Naumani Kutub Khana.

برکت اللہ. (2001). **مسیحیت کی عالمگیری**. لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب

Barakatullah. (2001). *Maseehiyat ki Aalmi Geeri*. Lahore: Al-Faisal Nashiran wa Tajiran Kutub.

برکت اللہ. (2010). **توضیح البیان فی اصول القرآن**. لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب

Barakatullah. (2010). *Tozih al-Bayan fi Usool al-Quran*. Lahore: Al-Faisal Nashiran wa Tajiran Kutub.

برکت اللہ. (2011). **دینِ فطرت اسلام یا مسیحیت**. لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب

Barakatullah. (2011). *Deen-e-Fitrat Islam ya Maseehiyat*. Lahore: Al-Faisal Nashiran wa Tajiran Kutub.

پیر محمد کرم شاہ الازہری. (2011). **ضیاء القرآن** (جلد 5). لاہور: ضیاء القرآن پبلیکیشنز

Pīr Muhammad Karam Shāh al-Azharī. (2011). *Zia-ul-Quran* (Vol. 5). Lahore: Zia-ul-Quran Publications.

دریابادی، عبدالماجد. (1998). **تفسیر ماجدی** (جلد 1). کراچی: مجلس نشریاتِ قرآن

Daryabadi, Abdul Majid. (1998). *Tafseer-e-Majidi* (Vol. 1). Karachi: Majlis Nashriyat-e-Quran.

عثمانی، شبیر احمد. (2010). **تفسیر عثمانی**. لاہور: لائف گارڈ پرنٹرز

Usmani, Shabbir Ahmad. (2010). *Tafseer-e-Usmani.* Lahore: Lifeguard Printers.

مودودی، ابوالاعلیٰ. (2011). **تفہیم القرآن** (جلد 6). لاہور: ادارہ ترجمان القرآن

Maududi, Abul A'la. (2011). *Tafheem-ul-Quran* (Vol. 6). Lahore: Idara Tarjuman-ul-Quran